ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 404

Program:

Semester: Autumn 2026

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

Course: Urdu (404) • Level: B.A.

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 2 (Units 6-9)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and reference purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the concepts, and then write the assignment in their own words. Total marks of the assignment are 100; each question carries the marks shown with it.

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے ہے۔ طلبہ اسے پڑھ کر مضمون کو سمجھیں اور پھر امتحانی سوال کے مطابق اپنے الفاظ میں لکھیں۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال نمبر 1: مولانا حالی کی درج ذیل دو غزلیات کی تشریح کریں۔ (الف) دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا (ب) اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت

تعارف

مولانا الطاف حسین حالی (1837ء تا 1914ء) اردو کے ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے غزل کو روایتی عشقیہ مضامین کے محدود دائرے سے نکال کر زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ حالی بنیادی طور پر نظم کے شاعر اور "مسدس حالی" کے خالق کی حیثیت سے مشہور ہیں، لیکن ان کی غزلیں بھی ان کے سادہ، پر خلوص اور حقیقت پسندانہ مزاج

کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی غزل میں دلی اور لکھنؤ کی پرانی تکلف بازی نہیں ملتی؛ اس کے بجائے سچا جذبہ، صاف زبان اور اخلاقی و انسانی مضامین ملتے ہیں۔ ذیل میں ان کی دو مشہور غزلوں کی تشریح پیش کی جاتی ہے جن کے مطلع سوال میں دیے گئے ہیں۔

غزل (الف): مطلع کی تشریح

پہلی غزل کا مطلع ہے: "دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا / سینے میں یہ داغ ہے، کہ مٹایا نہ جائے گا"۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا خیال دل سے کسی طرح نہیں نکالا جا سکتا۔ کوشش کے باوجود یہ خیال ذہن میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اب یہ میری ذات کا حصہ بن چکا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اس کیفیت کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ سینے میں عشق کا ایک داغ پڑ چکا ہے اور یہ داغ ایسا نہیں کہ وقت کے ساتھ مٹ جائے۔ داغ یہاں عشق کی پوری زندگی کے دائمی اثر کی علامت ہے۔ حالی نے بڑی سادگی سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ سچی محبت وقتی جذبہ نہیں ہوتی؛ یہ دل پر نقش چھوڑ جاتی ہے جو عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔

اس غزل کے بقیہ اشعار میں بھی یہی کیفیت مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز بھلائی جا سکتی ہے مگر جسے دل میں جگہ مل جائے اسے بھلانا انسان کے بس میں نہیں رہتا۔ اس غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فارسی غزل کی پیچیدگی اور علامت بازی کے بجائے سیدھا سچا انسانی تجربہ پیش کیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے زندگی میں کسی سے حقیقی لگاؤ رکھا ہو، اس شعر کو پڑھ کر اپنے دل کی کیفیت اس میں دیکھ سکتا ہے۔ حالی کا یہی انداز انہیں روایتی غزل گو شعرا سے جدا کرتا ہے کہ ان کے یہاں عشق محض دکھاوا نہیں بلکہ زندہ تجربہ ہے۔

اس غزل کا فنی حسن اس کی سادگی میں ہے۔ الفاظ عام فہم ہیں، تراکیب سہل ہیں اور مصرعے روانی سے آگے بڑھتے ہیں۔ "خیالِ دوست" اور "داغ" جیسے الفاظ اگرچہ غزل کی روایت سے آئے ہیں، مگر حالی نے انہیں اس طرح استعمال کیا ہے کہ نئے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ خیالِ دوست یہاں محض تصور نہیں بلکہ ایسی موجودگی ہے جو تنہائی میں بھی ساتھ رہتی ہے، اور داغ محض زخم نہیں بلکہ محبت کی سند ہے جسے عاشق مٹانا چاہتا بھی نہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو یہ غزل وفا اور ثابت قدمی کا درس دیتی ہے کہ سچی نسبت وقتی نہیں ہوتی۔

غزل (ب): مطلع کی تشریح

دوسری غزل کا مطلع ہے: "اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت / نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت"۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے چلے جانے کے بعد گھر کی حالت اس قدر بدل گئی ہے کہ اب اسے پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ نہ دیوار وہی دیوار لگتی ہے اور نہ دروازہ وہی دروازہ۔ ظاہر ہے دیواریں اور دروازے ویسے ہی ہیں، مگر محبوب کی موجودگی جس رونق اور زندگی کا سبب تھی، اس کے ختم ہوتے ہی پورا گھر ویران اور بے جان محسوس ہونے لگا ہے۔ یہ شعر انسانی نفسیات کی گہری حقیقت بیان کرتا ہے کہ جگہوں کی قدر ان میں رہنے والوں سے ہوتی ہے؛ محبوب جائے تو مکان کھنڈر بن جاتا ہے۔

اس غزل میں حالی نے جدائی کے بعد کی ویرانی کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ گھر جو کبھی زندگی اور حرکت کا مرکز تھا اب خاموشی اور اداسی کی تصویر ہے۔ ہر چیز موجود ہے مگر اس کی روح نکل چکی ہے۔ شاعر نے یہاں محاورے کی زبان میں بڑی بات کہی ہے۔ "صورت" کے لفظ کی تکرار نے شعر میں ایک خاص آہنگ اور تاثر پیدا کر دیا ہے کہ قاری کو بھی وہ ویرانی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ غزل حالی کے اس مزاج کی نمائندہ ہے جس میں وہ روزمرہ کے مشاہدے کو شعر میں ڈھال کر عالمگیر انسانی تجربہ بنا دیتے ہیں۔

اس غزل کے دیگر اشعار میں بھی ہجر و فراق، دنیا کی بے ثباتی اور گزرے ہوئے خوشگوار زمانے کی یاد جیسے مضامین ملتے ہیں۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ وہ رونے دھونے اور مبالغے کے بجائے بڑی سادگی اور وقار سے دکھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں آہ و زاری کی جگہ ایک ٹھہرا ہوا غم ہے جو زیادہ پراثر ہوتا ہے۔ اس غزل کو پڑھتے ہوئے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا محبوب محض فرد ہی نہیں بلکہ اس سے زندگی کی پوری رونق وابستہ ہے، اس لیے اس کی جدائی پورے وجود کی ویرانی بن گئی ہے۔

دونوں غزلوں کا مجموعی جائزہ

دونوں غزلوں کا باہمی مطالعہ کرنے سے حالی کے غزلیہ مزاج کی تین نمایاں باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ان کی غزل جذبے کی سچائی پر کھڑی ہے؛ دوسری یہ کہ ان کی زبان غیر ضروری بناوٹ سے پاک اور بول چال کے قریب ہے؛ تیسری یہ کہ وہ عشقیہ مضمون میں بھی انسانی وقار اور اخلاقی توازن برقرار رکھتے ہیں۔ حالی نے خود اپنے "مقدمہ شعر و

شاعری" میں جس نیچرل شاعری کا نظریہ پیش کیا تھا، ان کی یہ غزلیں اسی نظریے کی عملی مثال ہیں۔ ان غزلوں میں نہ مشکل پسندی ہے نہ مصنوعی فلسفہ، بس دل کی صاف ستھری کیفیت ہے اسی لیے یہ آج بھی اسی طرح تازہ ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حالی کی یہ دو غزلیں اردو غزل میں سادگی، سچائی اور حقیقت پسندی کی بہترین مثالیں ہیں۔ پہلی غزل محبت کی دائمی کیفیت اور بھلائے نہ جانے والے خیالِ دوست کی ترجمان ہے، جبکہ دوسری غزل محبوب کی جدائی کے بعد گھر اور زندگی کی ویرانی کا دلِ مرقع ہے۔ حالی نے ثابت کیا کہ بڑا شعر کہنے کے لیے بڑے بڑے الفاظ نہیں بلکہ بڑا اور سچا تجربہ چاہیے، اور یہی سبق ان کی غزل آج کے قاری کو بھی دیتی ہے۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

سوال نمبر 2: آتش کی درج ذیل غزلیات کی تشریح کریں۔ (الف) آئینہ سینہ صاحبِ نظراں ہے کہ جو تھا (ب) ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا

تعارف

خواجہ حیدر علی آتش (1778ء تا 1847ء) دبستانِ لکھنؤ کے سب سے نمایاں غزل گو شاعر ہیں۔ وہ مصحفی کے شاگرد تھے اور ان کی شاعری لکھنؤ کی تہذیب، زبان کی صفائی، محاورے کی چاشنی اور خیال کی لطافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے اور ناسخ کے درمیان شاعرانہ مسابقت اردو ادب کی مشہور داستان ہے جس نے اس دور کی غزل کو خوب نکھارا۔ آتش کی غزل کا مزاج تصوف، دنیوی تجربات اور انسانی نفسیات کا امتزاج ہے۔ ذیل میں ان کی دو غزلوں کی تشریح پیش کی جاتی ہے۔ ان غزلوں کے مطالعے سے آتش کے فنی کمالات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

غزل (الف): مطلع کی تشریح

پہلی غزل کا مطلع ہے: "آئینہ سینہ صاحبِ نظراں ہے کہ جو تھا"۔ اس شعر میں شاعر اپنے سینے یعنی دل کو آئینہ قرار دیتا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ اہلِ نظر یعنی بصیرت رکھنے والوں کا سینہ آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوتا ہے اور پھر حقیقت میں تھا وہ اسی آئینے میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس انسان کا دل کدورت، حسد اور خود غرضی سے پاک ہو جائے، اسے حقیقتیں ویسی ہی نظر آنے لگتی ہیں جیسی وہ ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاح میں دل کو آئینہ کہنا عام ہے کہ جب یہ آئینہ صاف ہو تو اس میں جمالِ حق کا عکس نظر آتا ہے۔ آتش نے اسی روایتی مضمون کو لکھنوی زبان کے صاف ستھرے انداز میں ادا کر کے نیا بنا دیا ہے۔

اس غزل کے طبعی رنگ میں تصوف اور خود شناسی کے مضامین غالب ہیں۔ شاعر جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی اصل کامیابی باہر کی دنیا فتح کرنے میں نہیں بلکہ اپنے اندر کی دنیا کو سنوارنے میں ہے۔ دل اگر آئینہ بن جائے تو کائنات کے راز خود بخود آشکار ہونے لگتے ہیں۔ آتش کی خوبی یہ ہے کہ وہ یہ خشک فلسفیانہ باتیں بھی غزل کے لطیف پیرائے میں کہتے ہیں؛ قاری کو وعظ سننے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ شعر کا لطف ملتا ہے۔ یہی توازن ان کی شاعری کی پہچان ہے۔

اس غزل کی زبان آتش کے دبستان کی نمائندہ ہے۔ لکھنؤ میں زبان کی صفائی اور محاورے کی درستی کو شاعری کا کمال سمجھا جاتا تھا اور آتش اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے مصرعے غیر ضروری فارسی بوجھ سے خالی، روزمرہ کے قریب اور کانوں کو بھلے لگنے والے ہیں۔ آئینے کی تشبیہ بھی اردو شاعری کی معروف تشبیہ ہے، مگر آتش نے "صاحبِ نظراں" کی ترکیب کے ساتھ اسے جو فکری وسعت دی ہے وہ ان کی انفرادیت ہے کہ شعر ظاہری حسن کے بیان سے بڑھ کر بصیرت کی دعوت بن گیا ہے۔

غزل (ب): مطلع کی تشریح

دوسری غزل کا مطلع ہے: "ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا"۔ اس شعر کا تعلق تخلیقِ آدم کے واقعے اور انسان کی عظمت کے مضمون سے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب خاک سے بنے ہوئے آدم کا ظہور ہوا تو ہمیں اس حقیقت کا یقین آ گیا کہ مٹی جیسی حقیر چیز بھی خالق کی قدرت سے ایسی عظمت پا سکتی ہے کہ فرشتے اسے سجدہ کریں۔ مراد یہ ہے کہ

انسان کی قدر اس کے مادی اصل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس روح اور علم کی وجہ سے ہے جو اس میں پھونکی گئی۔ خاکی ہونے کے باوجود انسان اشرف المخلوقات ہے۔ آتش نے قرآن مجید کی اس بنیادی تعلیم کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اس شعر میں انسانی عزتِ نفس کا بڑا پیغام پوشیدہ ہے۔ انسان عموماً اپنی کمزوریوں اور مٹی سے بنے ہونے کو اپنی حقارت کی دلیل سمجھتا ہے، لیکن شاعر کے نزدیک یہی مٹی عظمت کی بنیاد ہے کیونکہ خدا نے اسی کو اپنی خلافت کے لیے چنا۔ اس غزل کے دیگر اشعار میں بھی انسان کی حیثیت، اس کی ذمہ داری اور دنیا میں اس کے مقام جیسے مضامین آتے ہیں۔ آتش کی شاعری میں یہ دینی و فکری رنگ اس لیے نمایاں ہے کہ وہ محض عشق و حسن کے شاعر نہیں تھے؛ ان کی نظر زندگی کے بڑے سوالات پر بھی تھی۔

فن کے اعتبار سے اس غزل میں آتش نے مذہبی مضمون کو غزل کی روایت کے اندر رہتے ہوئے سمویا ہے۔ الفاظ میں خطابت کا زور نہیں بلکہ شعر کی نرمی برقرار ہے۔ "آدمِ خاکی" کی ترکیب بذاتِ خود ایک تضاد رکھتی ہے: آدم یعنی سب سے افضل مخلوق اور خاکی یعنی مٹی سے بنا ہوا۔ اسی تضاد سے شعر میں معنی کی وسعت پیدا ہوتی ہے کہ قاری ایک مصرعہ پڑھ کر پوری تخلیقی کہانی اور انسان کے مقام کو سوچنے لگتا ہے۔ یہی آتش کا کمال ہے کہ وہ کم الفاظ میں بڑا مضمون سمو دیتے ہیں۔

دونوں غزلوں کا مجموعی جائزہ

دونوں غزلوں کے مطالعے سے آتش کی شاعری کے تین بڑے پہلو سامنے آتے ہیں۔ پہلا پہلو فکری گہرائی ہے: دل کی صفائی، بصیرت اور انسان کی عظمت جیسے موضوعات ان کی غزل کو محض تفریحی شاعری سے بلند کرتے ہیں۔ دوسرا پہلو زبان کی لکھنوی صفائی اور محاورے کی مہارت ہے جس نے ان کی غزل کو اس دور کا معیار بنایا۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تصوف اور دین کے مضامین کو غزل کے مزاج میں ڈھال کر پیش کیا اور خطابت سے گریز کیا۔ نقادوں نے آتش کو لکھنؤ کا سب سے متوازن غزل گو قرار دیا ہے کیونکہ ان کے یہاں ناسخ کی زبان دانی بھی ہے اور میر کی گہرائی کی جھلک بھی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ آتش کی یہ دو غزلیں ان کے فکری اور فنی کمال کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پہلی غزل دل کو آئینہ بنانے اور اہلِ نظر کی بصیرت کا بیان ہے، جبکہ دوسری غزل خاک سے بنے انسان کی عظمت اور اس کے مقام کا اعلان ہے۔ آتش نے لکھنؤ کی صاف ستھری زبان میں ایسے اشعار کہے جو معنی اور لفظ دونوں اعتبار سے آج بھی تازہ ہیں۔ اردو غزل کی تاریخ میں ان کا مقام اسی لیے بلند ہے کہ انہوں نے غزل کو زبانی کمال کے ساتھ فکری وقار بھی عطا کیا۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

سوال نمبر 3: ناصر کاظمی کی درج ذیل غزلیات کی تشریح کریں۔ (الف) گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ (ب) گلی گلی میری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

تعارف

ناصر کاظمی (1925ء تا 1972ء) جدید اردو غزل کے سب سے مقبول اور دل نشین شاعروں میں سے ہیں۔ وہ انبالہ میں پیدا ہوئے، قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ ان کی غزل میں چھوٹی بحروں کا انتخاب، سادہ اور بول چال کی زبان، اداسی اور تنہائی کا رومانوی مگر سچا لہجہ اور گزری ہوئی تہذیب سے وابستگی نمایاں ہے۔ ناصر کی شاعری کا مرکزی موضوع وہ دنیا ہے جو بچھڑ گئی، وہ لوگ ہیں جو چلے گئے اور وہ شہر ہیں جو اجڑ گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کی ہجرت اور تہذیبی شکست و ریخت ان کی غزل کی فضا بناتی ہے۔ ذیل میں ان کی دو مشہور غزلوں کی تشریح پیش کی جاتی ہے۔

غزل (الف): مطلع کی تشریح

پہلی غزل کا مطلع ہے: ”گلی گلی آباد تھی جن سے، کہاں گئے وہ لوگ / دلی کے رہنے والے تھے، ہم کو بھی یاد ہے وہ لوگ“ کی کیفیت لیے ہوئے یہ غزل دراصل ایک پورے عہد کے خاتمے کا مرثیہ ہے۔ شاعر اپنے بچپن اور جوانی کے دلی کو یاد کرتا ہے جہاں کی گلیاں اور محلے زندہ دل لوگوں سے آباد تھے۔ ہر گلی کی اپنی رونق تھی، ہر محلے کی اپنی محفل

تھی۔ مگر وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ لوگ یا مر گئے یا ہجرت کر کے بکھر گئے۔ شاعر کا سوال "کہاں گئے وہ لوگ" صرف چند افراد کے بارے میں نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب، ایک پورے طرزِ زندگی کے بارے میں ہے جو ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

اس غزل میں ناصر نے شہر کو انسانوں سے پہچانا ہے۔ شہر ایسٹ پتھر کا نام نہیں ہوتا؛ شہر اس میں بسنے والوں کے دم سے زندہ ہوتا ہے۔ جب وہ لوگ چلے جائیں جن سے گلیاں آباد تھیں تو شہر موجود رہ کر بھی اجنبی ہو جاتا ہے۔ یہی احساس تقسیم کے بعد کے ہر اس شخص کا ہے جو اپنا پرانا شہر چھوڑ آیا یا اپنے شہر میں رہ کر اس کی بدلی ہوئی صورت دیکھ رہا ہے۔ ناصر نے اس اجتماعی تجربے کو اتنی سادگی سے بیان کیا ہے کہ غزل ذاتی ہونے کے بجائے پوری نسل کا نوحہ بن گئی ہے۔

اس غزل کا لہجہ حسرت اور یاد کا ہے، مگر اس میں تلخی اور شکوے کی تندی نہیں۔ شاعر گزرے ہوئے لوگوں کو الزام نہیں دیتا، زمانے کو کوسا بھی نہیں؛ وہ بس حیران ہے کہ اتنی آباد دنیا اتنی جلدی کیسے اجڑ گئی۔ غزل کے اشعار میں دلی کی پرانی محفل آرائی، دوستوں کی صحبت اور شاموں کی رونق کی جھلکیاں ملتی ہیں جو اب صرف یادوں میں باقی ہیں۔ فنی اعتبار سے "گلی گلی" کی تکرار اور سادہ زبان نے اس غزل کو عام قاری کے دل کے بہت قریب کر دیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار زبان زدِ عام ہو چکے ہیں۔

غزل (ب): مطلع کی تشریح

دوسری غزل کا مطلع ہے: "گلی گلی میری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل / مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میرے سائے سے بچ کے چل" کے مضمون پر قائم یہ غزل محبوب سے خطاب میں کہی گئی ایک انوکھے انداز کی غزل ہے۔ شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ اس شہر کی ہر گلی میں میری یادیں بکھری پڑی ہیں، اس لیے تم سنبھل کر چلنا کہیں کوئی یاد تمہارے پاؤں سے نہ لپٹ جائے۔ دوسرے مصرعے میں وہ شکوے کے لہجے میں کہتا ہے کہ اگر تمہیں مجھ سے اس قدر وحشت اور نفرت ہے تو میرے سائے سے بھی بچ کر چلنا۔ ظاہر ہے سائے سے بچنا ممکن نہیں، اسی ناممکن بات میں شعر کا سارا حسن پوشیدہ ہے کہ محبوب چاہے بھی تو عاشق کی یاد اور اس کے سائے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

اس غزل میں جدائی کے بعد کی کیفیت بڑے لطیف انداز میں بیان ہوئی ہے۔ عاشق خود موجود نہیں مگر اس کی یاد جگہ جگہ موجود ہے۔ گلیاں، رستے اور شہر کی فضا اس کی موجودگی کی گواہی دیتے ہیں۔ ناصر کے یہاں یہ مضمون اس لیے اور گہرا ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں شہر اور یاد لازم و ملزوم ہیں۔ محبوب سے دوری دراصل اپنے ماضی، اپنے شہر اور اپنی ذات سے دوری کی علامت بھی بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ غزل محض عشقیہ نہیں بلکہ وجودی تنہائی کی غزل ہے۔

غزل کے مزاج میں ناصر کا مشہور درد اور شام و اداسی کا رنگ بھی شامل ہے۔ ان کی بہت سی غزلوں کی طرح یہاں بھی وقت گزرنے، موسم بدلنے اور رات ڈھلنے کی کیفیات انسانی جدائی کے ساتھ گھل مل جاتی ہیں۔ زبان انتہائی سادہ ہے؛ ”پیارے“ جیسا لفظ بھی جو قربت پیدا کرتا ہے وہ اس غزل کو فارسی زدہ غزل سے الگ کر کے خالص اردو بول چال کی غزل بنا دیتا ہے۔ چھوٹی بحر اور ہلکی آہنگ نے اس میں گیت جیسی روانی پیدا کر دی ہے۔

دونوں غزلوں کا مجموعی جائزہ

دونوں غزلیں ناصر کاظمی کے مزاج کے دو رخ پیش کرتی ہیں۔ پہلی غزل اجتماعی یاد اور تہذیبی نقصان کی غزل ہے جس میں اجڑے ہوئے شہر اور بچھڑے ہوئے لوگوں کا غم ہے۔ دوسری غزل ذاتی عشق اور جدائی کی غزل ہے جس میں محبوب سے شکوہ اور یاد کی ہر جگہ موجودگی کا بیان ہے۔ لیکن دونوں میں بنیادی عنصر ایک ہی ہے اور وہ ہے ”یاد“۔ ناصر بنیادی طور پر یاد کے شاعر ہیں؛ ان کی شاعری کا سورج اسی یاد کے گرد گھومتا ہے۔ ان کی زبان کی سادگی، لہجے کی نرمی اور درد کی سچائی نے انہیں اپنے دور کا سب سے دل نشین غزل گو بنایا۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ ناصر نے میر کے درد اور غالب کی سادگی دونوں کو اپنے مختصر کلام میں سمو لیا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی یہ دو غزلیں جدید اردو غزل کی پہچان ہیں۔ پہلی غزل ایک اجڑتی تہذیب کا نوحہ ہے جو سوال کرتی ہے کہ گلیاں آباد رکھنے والے لوگ کہاں گئے، جبکہ دوسری غزل یاد کی ہمہ گیری اور محبوب کی بے رخی کا لطیف شکوہ ہے۔ دونوں غزلوں نے سادہ زبان میں بڑے انسانی تجربات بیان کیے ہیں، اسی لیے یہ غزلیں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی اسی طرح مقبول اور دل گداز ہیں۔ ناصر کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے ذاتی درد کو سب کا درد بنا دیا۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

سوال نمبر 4: اردو ناول کے ارتقائی سفر کو اختصاراً مگر جامعیت سے بیان کریں۔

تعارف

ناول اردو نثر کی سب سے اہم اور مقبول صنف ہے۔ یہ ایک طویل نثری داستان ہوتی ہے جس میں انسانی زندگی کو اس کی پوری وسعت، پیچیدگی اور حقیقت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے سے اس کا فرق یہ ہے کہ ناول میں کرداروں کی پوری زندگی، سماج کا پورا منظر اور واقعات کی لمبی زنجیر بیان ہوتی ہے۔ اردو ناول نے ڈیڑھ صدی کے سفر میں داستان کی خیالی دنیا سے نکل کر حقیقی زندگی کی عکاسی تک کا طویل فاصلہ طے کیا ہے۔ ذیل میں اس ارتقائی سفر کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

پس منظر: داستان سے ناول تک

ناول سے پہلے اردو میں قصہ اور داستان کی روایت موجود تھی۔ "باغ و بہار"، "فسانۂ عجائب" اور "داستانِ امیر حمزہ" جیسی داستانیں طویل ضرور تھیں، مگر ان کا تعلق خیالی اور مافوق الفطرت دنیا سے تھا؛ ان میں دیو، پریاں اور جادو عام تھے اور کردار انسانی ہونے کے بجائے مہماتی نمونے تھے۔ انیسویں صدی میں انگریزی تعلیم، چھاپہ خانے اور مغربی ادب سے واقفیت نے اردو ادب میں حقیقت نگاری کی راہ ہموار کی اور یہیں سے ناول کا آغاز ہوا۔

ابتدائی دور: اصلاحی ناول

اردو کا پہلا ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد (1830ء تا 1912ء) کو مانا جاتا ہے۔ ان کا "مراۃ العروس" (1869ء) اردو کا پہلا ناول سمجھا جاتا ہے جس میں اکبری اور اصغری کے کرداروں کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا سبق دیا گیا۔ ان کے دیگر ناول "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت" اور "رویائے صادقہ" بھی اصلاحی مقصد رکھتے ہیں۔ اس دور کے

ناول میں فنی کمزوریاں موجود تھیں؛ واقعات وعظ کے تابع تھے اور کردار اچھائی یا برائی کے نمونے تھے، لیکن اردو ناول کی بنیاد اسی دور میں پڑی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" نے اس دور میں زبان کی رنگینی اور لکھنؤ کی تہذیب کی تصویر کشی سے ناول کو دلچسپ بنایا۔

تاریخی اور رومانی ناول کا دور

نذیر احمد کے بعد عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناولوں کی روایت قائم کی۔ "ملک العزیز ورجینا" اور "فلورا فلورنڈا" جیسے ناولوں نے مسلمانوں کی ماضی کی عظمت کو رومانی انداز میں پیش کیا۔ اسی دور میں مرزا محمد ہادی رسوا کا "امراؤ جان ادا" (1899ء) اردو ناول کی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا، کیونکہ اس میں پہلی بار ایک طوائف کی زندگی کو نفسیاتی گہرائی اور غیر جانبدارانہ حقیقت نگاری سے پیش کیا گیا۔ یہ ناول اردو میں کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا اہم سنگ میل شمار ہوتا ہے۔

پریم چند اور حقیقت نگاری کا عروج

بیسویں صدی کے اوائل میں منشی پریم چند نے اردو ناول کو حقیقی عروج بخشا۔ "بازارِ حسن"، "گوشۂ عافیت"، "نرملا"، "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" جیسے ناولوں میں انہوں نے کسانوں، مزدوروں، عورتوں اور نچلے طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا۔ ان کے یہاں ناول اصلاح کے ساتھ ساتھ سماجی تنقید کا ذریعہ بن گیا۔ پریم چند کے ہم عصر سجاد ظہیر، کرشن چندر اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ناول نگاروں نے ناول کو استحصالی نظام کے خلاف آواز بنایا۔ اس دور میں ناول کی تکنیک، پلاٹ سازی اور کرداروں کی نفسیات میں بہت ترقی ہوئی۔

جدول 1: اردو ناول کے ارتقا کے اہم مراحل

دور	نمایاں ناول نگار / ناول	مرکزی خصوصیت
ابتدائی و اصلاحی دور	نذیر احمد: مراۃ العروس، سرشار: فسانۂ آزاد	اخلاقی اصلاح، تعلیم نسواں، زبان کی رنگینی

تاریخی و رومانی دور	شرر کے تاریخی ناول، رسوا: امراؤ جان ادا	ماضی کی عظمت، رومان، نفسیاتی کردار نگاری
حقیقت نگاری کا دور	پریم چند، ترقی پسند ناول نگار	کسان و مزدور کی زندگی، سماجی تنقید
جدید دور	قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین	تہذیبی تاریخ، تقسیم کا المیہ، نئی تکنیکیں

تقسیم کے بعد: جدید ناول

1947ء کی تقسیم نے اردو ناول کو نیا موضوع عطا کیا: ہجرت کا المیہ۔ قرۃ العین حیدر کے "آگ کا دریا" (1959ء) نے ناول کو تہذیبی تاریخ کی وسعت دی اور وقت کی روانی میں کرداروں کو رکھ کر دکھایا۔ عبداللہ حسین کے "اداس نسلیں" نے تقسیم کو ایک خاندان کی تین نسلوں کے ذریعے پیش کیا اور اردو کے بڑے ناولوں میں شمار ہوا۔ انتظار حسین کے "بستی" اور شوکت صدیقی کے "خدا کی بستی" نے شہری زندگی اور سماجی بے حسی کو موضوع بنایا۔ خدیجہ مستور کا "آنگن" خواتین کے نقطہ نظر سے سیاسی تاریخ کا جائزہ ہے۔

موجودہ صورتِ حال

آج کا اردو ناول موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے بہت وسیع ہو چکا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، انور سجاد اور نئی نسل کے ناول نگاروں نے انسانی نفسیات، شہری تنہائی، عالمی سیاست اور وجودی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ "راجہ گدھ" جیسے ناول نے حلال و حرام کے فلسفے کو بیانیے میں ڈھالا، جبکہ مقبول عام ناولوں نے قارئین کی بڑی تعداد کو اس صنف سے جوڑے رکھا۔ ڈائجسٹ ادب اور سوشل میڈیا کے دور میں بھی ناول اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور ہر سال نئے موضوعات کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔

اس سفر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اردو ناول نے ہر دور میں اپنے قاری کی بدلتی ہوئی ذہنی سطح کا ساتھ دیا ہے اور یہی لچک اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔

ناول کی تکنیک میں ترقی

اردو ناول کے ارتقا کی کہانی صرف موضوعات کی تبدیلی نہیں بلکہ تکنیک کی ترقی بھی ہے۔ ابتدائی ناولوں میں مصنف خود درمیان میں آ کر وعظ کرتا تھا اور واقعات اتفاقات سے آگے بڑھتے تھے۔ پریم چند کے دور میں پلاٹ کی منصوبہ بندی، کرداروں کی نفسیاتی گہرائی اور مکالمے کی فطری صورت پیدا ہوئی۔ جدید دور میں شعور کی رو، خطوط وڈائری کا اسلوب، رمزیہ بیان اور مختلف زاویوں سے کہانی سنانے کی تکنیکیں عام ہوئیں۔ اسی طرح زبان بھی بدلی؛ داستانی اردو کی جگہ علاقائی لہجے، پیشہ ورانہ زبان اور بول چال نے لے لی جس سے کردار زندہ محسوس ہونے لگے۔ یہ فنی ترقی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ناول محض کہانی نہیں رہا بلکہ ایک مکمل فن بن چکا ہے جس میں مصنف کردار کے اندر اتر کر اس کی سوچ تک کو بیان کرتا ہے۔ یہی پختگی اس صنف کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اردو ناول کا سفر داستان کی خیالی دنیا سے شروع ہو کر نذیر احمد کی اصلاحی کوششوں، شرر و رسوا کی رومانیت و نفسیات، پریم چند کی حقیقت نگاری اور جدید دور کی تہذیبی و تجرباتی وسعت تک پہنچا ہے۔ ہر دور نے اس صنف کو نیا موضوع، نئی تکنیک اور نئی زبان دی۔ یہ ارتقا دراصل برصغیر کے مسلمان سماج کی اپنی تبدیلیوں کی داستان ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ناول کو اس سماج کی سب سے مکمل ادبی تصویر قرار دیا جاتا ہے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

سوال نمبر 5: مولانا الطاف حسین حالی اردو کے ایک اہم شاعر ہیں۔ تبصرہ کریں۔

تعارف

مولانا الطاف حسین حالی (1837ء تا 1914ء) اردو ادب کی ان عظیم شخصیات میں سے ہیں جن کے بغیر جدید اردو ادب کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، سوانح نگار اور مصلح تھے۔ پانی پت میں پیدا ہونے والے حالی نے دلی میں تعلیم پائی، غالب کے حلقے سے فیض حاصل کیا اور بعد میں سر سید احمد خان کی تحریک سے گہری وابستگی اختیار کی۔ ان کی شہرت کا سب سے بڑا سبب "مسدسِ حالی" یعنی "مدوجزرِ اسلام" ہے، لیکن ان کی اہمیت صرف ایک نظم تک محدود نہیں؛ انہوں نے اردو شاعری کے نظریات ہی بدل کر رکھ دیے۔ ذیل میں حالی کی شاعری اور ان کی ادبی خدمات پر تفصیل پیش کی جاتا ہے۔

مسدس حالی: شاعری کا سنگِ میل

1879ء میں سر سید کی فرمائش پر لکھی گئی "مسدس حالی" اردو شاعری کی تاریخ کی انقلابی نظم ہے۔ اس میں حالی نے مسلمانوں کے ماضی کی عظمت، حال کے زوال اور اس کے اسباب کو بڑے درد اور سچائی سے بیان کیا۔ یہ نظم چھ مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہے اور اس کے اشعار آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔ اس نظم نے پوری قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا؛ گھروں، مدرسوں اور جلسوں میں یہ پڑھی جانے لگی اور اسے پڑھ کر سننے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ نقادوں کا اتفاق ہے کہ کوئی دوسری نظم اردو میں اس قدر اجتماعی اثر پیدا نہیں کر سکی۔ اسی لیے حالی کو بجا طور پر اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

نیچرل شاعری کا نظریہ

حالی کی شاعرانہ اہمیت کا دوسرا بڑا پہلو ان کا نیچرل شاعری کا نظریہ ہے جو انہوں نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" (1893ء) میں پیش کیا۔ حالی نے اردو شاعری کی روایتی روش پر تنقید کی جس میں مبالغہ، مصنوعی مضامین اور محض قافیہ پیمائی کو کمال سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ شاعری کو زندگی کی حقیقتوں، سچے جذبات اور فطری زبان میں ہونا چاہیے۔ شعر وہ ہے جو دل سے نکلے اور دل میں اترے۔ اس مقدمے نے اردو تنقید کی بنیاد رکھ دی اور آنے والی نسلوں کے شعرا کے لیے نئی راہ کھول دی۔ اقبال جیسے عظیم شاعر کی شاعری بھی اسی نئی راہ کا تسلسل ہے۔

قومی واصلاحی شاعری

حالی کی نظموں کا مرکزی موضوع قوم کی اصلاح ہے۔ "مناجاتِ بیوہ"، "چپ کی داد" اور بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں انہوں نے سماج کی ان برائیوں کی طرف توجہ دلائی جن کا ذکر اس سے پہلے شاعری میں کم ہوتا تھا۔ بیواؤں کی بے کسی، یتیموں کی محرومی اور عورتوں کی تعلیم جیسے موضوعات کو انہوں نے شاعری کا درجہ دیا۔ ان کا لہجہ ڈانٹ ڈپٹ کا نہیں بلکہ ہمدردی اور درد کا ہے۔ وہ قوم کے معالج کی طرح زخم دکھاتے ہیں، مگر ساتھ علاج بھی بتاتے ہیں۔ یہی اصلاحی کردار حالی کو محض شاعر سے بڑھا کر مصلح کا درجہ دیتا ہے۔

غزل میں حالی کا رنگ

حالی کی غزل ان کی نظم کی شہرت کے سائے میں دب گئی، مگر اس کا اپنا الگ مقام ہے۔ ان کی غزل میں سادگی، صفائی اور [illegible] نمایاں ہے۔ انہوں نے غزل کو فارسی کی مشکل تراکیب اور عاشقانہ مبالغے سے نکال کر روزمرہ کی زبان کے قریب کر دیا۔ ان کے اشعار میں اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں اور انسانی نفسیات کی جھلکیاں بھی۔ حالی کی غزل پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی شاعر کی آواز ہے جس نے مقدمے میں نیچرل شاعری کا درس دیا تھا؛ یعنی ان کے نظریے اور عمل میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ اتحاد اردو کے بہت کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔

قدرتی مناظر اور سادہ زبان

حالی کی شاعری کی ایک اور خصوصیت قدرتی مناظر کی تصویر کشی اور موسموں کا بیان ہے۔ "برکھارت" جیسی نظموں میں انہوں نے برصغیر کے موسم کو اس کے اپنے رنگ میں پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ اردو شاعری فارسی کے گل و بلبل کے بغیر بھی اپنے ماحول سے مضامین لے سکتی ہے۔ ان کی زبان عام بول چال کے قریب ہے؛ وہ مشکل الفاظ جان بوجھ کر نہیں لاتے۔ اس سادگی کی وجہ سے ان کی شاعری ہر طبقے کے قاری تک پہنچی اور تعلیمی نصاب کا حصہ بنی۔

تنقیدی آراء

نقادوں میں حالی کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ بعض نقاد ان کے فن کو نظم کی پابندیوں اور اصلاحی مقصد کی وجہ سے محدود قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقصدیت نے کہیں کہیں ان کے شعر کو خطابت کے قریب کر دیا ہے۔ لیکن اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ حالی کی اہمیت ان کے موضوعات کی جدت اور ان کے نظریاتی کردار میں ہے۔ شبلی نے انہیں اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیبِ قوم قرار دیا اور محمد حسین آزاد نے ان کی شاعری کو اردو میں نئے دور کا آغاز مانا۔ حالی کے بغیر اقبال کی قومی شاعری کا تصور مکمل نہیں ہوتا، اس لحاظ سے وہ جدید اردو شاعری کے بانیوں میں شامل ہیں۔

حالی کا مجموعی مقام

حالی کے مقام کا تعین کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ادب میں عظمت صرف اچھے اشعار کہنے سے نہیں آتی بلکہ نئی راہ دکھانے سے بھی آتی ہے۔ حالی نے یہ دونوں کام کیے۔ انہوں نے اردو شاعری کو خیالی دنیا سے نکال کر حقیقی زندگی کے دروازے پر کھڑا کر دیا اور آنے والوں کے لیے وہ چراغ جلایا جس کی روشنی میں اقبال، جوش اور فیض جیسے شعرا آگے بڑھے۔ ان کی رباعیات اور مشہور نظمیں آج بھی نصابوں اور مشاعروں میں زندہ ہیں۔ یہی زندہ روایت بتاتی ہے کہ حالی تاریخی شخصیت ہونے کے باوجود تاریخ نہیں بنے؛ وہ اب بھی اردو قاری کے حال کا حصہ ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی بلاشبہ اردو کے اہم ترین شعرا میں سے ہیں۔ "مسدس حالی" نے انہیں قوم کا محسن بنایا، "مقدمہ شعر و شاعری" نے انہیں جدید تنقید کا بانی قرار دیا اور ان کی قومی و اصلاحی نظموں نے شاعری کو محفل سے نکال کر قوم کی زندگی سے جوڑ دیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ شاعری محض دل لگی نہیں بلکہ قوموں کی تعمیر کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہی ان کی وہ خدمت ہے جس کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔